لیاقت علی *

# پنجاب کا جاگیردارانہ سماج اور طاہرہ اقبال کی افسانوی دنیا



اُردو فکشن کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو محمدی بیگم سے نیلم احمد بشیر تک خواتین کہانی کاروں کی ایک طویل فہرست دکھائی دیتی ہے۔ کہانی کی اپنے گردوپیش کے سماج سے جڑت ہو یا انسانی نفسیات کے پیچیدہ اور چونکا دینے والے مرحلے، خواتین افسانہ نگاروں نے بھرپور فنی چابکدستی اور گہرے سماجی شعور کے ساتھ کہانی کے اِس سفر کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ طاہرہ اقبال عہدِ حاضر کی ایسی باشعور اور حساس کہانی کار ہیں جنھوں نے پاکستان کے شہری سماج کے ساتھ ساتھ دیہی سماج کو خصوصی طور پر اپنے افسانے کا موضوع بنایا اور ایسے بیدار شعور کے ساتھ بنایا کہ پنجاب کا دیہی سماج اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔

پریم چند سے منشایاد تک دیہی سماج کو موضوع بنانے والے افسانہ نگاروں کی ایک پوری فہرست موجود ہے اِس فہرست میں احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، غلام الثقلین نقوی اور بہت سے دیگر نام شامل ہیں۔ طاہرہ اقبال کا اختصاصی پہلو جو انھیں اِن بڑے ناموں کے درمیان بھی قدآور بناتا ہے وہ اُن کا اِس سماج کے مسائل، یہاں کی نفسیات کو سمجھنا ہی نہیں بلکہ یہاں کے روزمرہ محاورے اور زبان کو اُردو کے ساتھ ملا کر ایک ایسا شاندار بیانیہ ترتیب دینا ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری اِسی سماج کا ایک

فرد بن جاتا ہے اور اُسے کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بظاہر غیر مہذب اور جانگلی زبان کہہ کر مہذب دنیا سے جلا وطن کی جانے والے یہ زبان کہ جسے بالعموم پنجابی تصور کیا جاتا ہے(حال آنکہ یہ رچناوی زبان ہے جسے عام طور پر جانگلی بھی کہا جاتا ہے) جب طاہرہ اقبال کی افسانوی دنیا میں تخلیقی تجربہ بن کر سامنے آتی ہے تو پڑھنے والے کو ششدر کر دیتی ہے۔ تب احساس ہوتا ہے کہ زبانوں کی اصل خوبصورتی اور اُس کا ابلاغ اِسے برتنے والے تخلیق کاروں کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ یوں بظاہر معتوب قرار پانے والی زبانیں بھی جب تخلیقی اعجاز کے ساتھ سامنے آئیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن کا ابلاغ نہ ہو یا وہ اپنے اندر بے شمار تخلیقی امکانات سموئے ہوئے نہ ہوں۔ طاہرہ اقبال کا افسانوی اسلوب اُردو اور رچناوی کے اسی امتزاج سے ترتیب پاتا ہے تو وہ سارا سماج بھی اپنی حقیقی صورت کے ساتھ ہمیں دکھائی دینے لگتا ہے۔ ہمیں پنجاب کے اِس پس ماندہ (کہ جسے دانستہ پس ماندہ رکھا گیا) سماج میں رہتے ہوئے دہلی، لکھنؤ یا حیدرآباد دکن کی اُس معیاری زبان کا محتاج نہیں ہونا پڑتا جس نے ہمارے ادیب سے اُس کی originality چھین کر اُسے تصنع کی بیساکھی تھما رکھی ہے اور وہ اِسی پر خوش ہے کہ وہ کتنی نتھری ہوئی اور معیاری اُردو لکھ رہا ہے۔ طاہرہ اقبال کے لیے بھی بہت آسان تھا کہ وہ اِسی زبان کا تتبع کرتی مگر اُس نے اپنے کلچر میں جینا اور اُسی کی زبان اور محاورے برتنے کو ترجیح دی، نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔

احمد ندیم قاسمی ہوں، منشا یاد، یا اَب طاہرہ اقبال، اُن کی کہانی اِس زمین کے اندر اُتری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اِس مٹی کا لمس اِن کہانیوں کا تخلیقی اعجاز ہے۔ واجدہ تبسم کے ہاں جس انداز میں حیدرآباد دکن کے نوابین اور اُن کے محلوں میں جنم لینے والی کہانیاں اُسی زبان کے لمس کے ساتھ قاری تک منتقل ہوئیں، طاہرہ کے ہاں وسطی پنجاب کے جاگیردارانہ سماج کو اپنی حقیقی زبان اور صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ واجدہ جنس کی پیچیدگیوں سے باہر نہ نکل سکی لیکن طاہرہ اقبال کا باریک بین مشاہدہ محض حویلیوں کے اندر کی زندگی تک محدود نہیں بلکہ ایک گہرا سیاسی، سماجی اور معاشرتی شعور بھی اِس کے پس منظر میں دکھائی دیتا ہے جو کسی سرسری مشاہدے یا سنی سنائی دانش سے کشید نہیں ہوتا بلکہ حقیقی تجربے سے تخلیقی تجربے میں ڈھلتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> علاقوں سے نسبت کا ڈھونگ اور بات ہے۔ تین چار نمائشی حوالوں کی تکرار بھی وہ زندہ

فضا نہیں بنا سکتی جو طاہرہ اقبال کے افسانوں میں محسوس ہوتی ہے اور یہ جڑی بوٹیوں کے نام کسی سیانے کے بتائے ہوئے نہیں، افسانہ نگار کی حیات میں پیوست ہیں اور اپنی دھرتی کی بُو باس سے اُس کے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ اور بات کہ وہ اسے کوئی جمال آفریں منظر نہیں بناتی، دکھ درد اور محرومی کے منظر نامے کا تاثر بڑھانے کے لیے ایک بامعنی عقبی پردے میں تبدیل کر دیتی ہیں۔[۱]

اِسی طرح عہد ظاہر کے نمایاں افسانہ نگار ڈاکٹر رشید امجد کے بقول:

طاہرہ اقبال جدید اُردو فکشن میں ایک مخصوص کلچر، زبان اور اسلوبِ حیات کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہیں۔ اُن کی کہانیاں پنجاب کی آب و ہوا، یہاں کی مٹی کی بو باس، موسموں کے رنگ ڈھنگ اور سماجی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کی بہت قریب سے کھینچی ہوئی تصویریں ہیں۔[۲]

طاہرہ اقبال کے فکر و فن کو ناقدین کی مندرجہ بالا آرا کی روشنی میں سمجھنے کے بعد اب اُن کی کہانیوں میں موجود جاگیردارانہ سماج کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ اُن کی جن کہانیوں میں اِسے پیش کیا گیا ہے اُن میں ''ریخت''، ''ملیچھ''، ''سوتنی''، ''گندا کیڑا''، ''کھندے''، ''انتخاب''، ''چوواہا'' اور ''عزت'' اہم ہیں۔

طاہرہ اقبال کا افسانہ ''ریخت'' اُن کے دوسرے افسانوی مجموعے کا عنوان ہی نہیں ایک افسانہ بھی ہے جو جاگیردار کے اُس تصور کو نمایاں کر رہا ہے جو مصنفہ کے ذہن میں موجود ہے۔ افسانہ دیہی سماج کی کہانی ہے۔ دینو ماچھی کی گاؤں میں پرچون کی دکان ہے جو بالترتیب دینو اور پھر اُس کی بیوی کی بیماری اور موت کے بعد اُن کی جواں سال بیٹی چھمی سنبھالتی ہے۔ والدین کی بیماری کے دوران ہی اُن کی عیادت کرنے اور خدمت کرنے والوں کا ایک تانتا دینو ماچھی کے گھر بندھا دکھائی دیتا ہے جو دراصل چھمی کی اُس بھرپور جوانی کا نتیجہ ہے جسے دیکھ کر سبھی اِس طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ چھمی گاؤں کے زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے نمائندے ملک غلام دستگیر پر نظرِ التفات ڈالتی ہے اور پھر اُس کی شادی کے موقعے پر اُس کی دلہن کو سلامی کا سب سے بڑا نوٹ بھی چھمی ہی دیتی ہے۔ غلام دستگیر زوال پذیر جاگیرداری نظام کا ایسا نمائندہ ہے جس کے پاس عظمت کے ثبوت کے لیے لمحۂ موجود کا

کوئی واقعہ نہیں محض اسلاف سے جڑے وہ قصے ہیں جن سے اُسے اپنی ذات کا اعتبار بحال ہوتا محسوس ہوتا ہے۔عظمت کے اِن قصوں میں بھی معیار وہی سماج کا وہی احساسِ تفاخر ہے جو طاقت، دولت اور حاکمیت ایسی صفات سے ترتیب پاتا ہے لیکن خود ملک غلام دستگیر لمحۂ موجود میں اِن چیزوں سے عاری ہے۔ بظاہر نچلی ذات سے تعلق رکھنے والی چھمی اُسے محبت ہی نہیں دیتی اُس کی معاشی ضرورتوں کا خیال بھی رکھتی ہے اور دکان سے سودا سلف بھی دیتی رہتی ہے۔افسانے کے آخر میں وہ اپنی بیوی کی زچگی کے لیے چھمی سے مالی معاونت مانگتا ہے جو وہ اپنی دکان بیچ کر بھی کرتی ہے۔چھمی کا کردار نچلے طبقے کی ایسی ناخواندہ لڑکی کا کردار ہے جو مروّج اخلاقی تقاضوں سے آشنا تو نہیں مگر اپنی محبت میں کامل ہے۔افسانے میں زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کی چند جھلکیاں دیکھیں:

> دینو ماچھی کی کمین، ڈھورڈنگروں سے ذرا اوپر کی مخلوق، مزارعوں تک کے ہاتھوں بے عزت ہونے والا۔[۳]

اس اقتباس میں نچلی ذات کے افراد کے تعارف میں ترتیب پانے والی زبان کو دیکھا جاسکتا ہے جو اِن کے لیے حقارت اور نفرت کو بھی واضح کرتی نظر آتی ہے۔اِسی طرح ملک گام کا تعارف دیکھیں:

> دراصل ملک گام بنا جاگیر کا نواب تھا۔نسل درنسل تقسیم کے بعد آباؤ اجداد کی بڑی جاگیر میں سے اُس تک ایک مختصر سا قطعۂ ارضی ہی منتقل ہوسکا۔ اس کے پاس نہ تو دولت اور جاگیر سے پخت کی ہوئی طاقت اور اقتدار موجود تھا اور نہ ہی روایات و اقدار سے ترکیب پائی ہوئی تقویت۔[۴]

اِس اقتباس میں جاگیرداری کے اُس زوال کو بھی دیکھا جاسکتا ہے جو نسل درنسل زمین کی تقسیم کے بعد دیکھنے میں آ رہا ہے اور اب یہ نئے جاگیردار محض وہ نشانیاں ہیں جو اسلاف کی طاقت اور نام نہاد شان وشوکت کے قصیدہ خواں اور وارث ہیں۔لیکن نئے عہد اور معاشی بدحالی کی بدولت وہ سب نہیں کر پاتے جو اُن کے اسلاف کرتے آئے تھے۔اب اِن کی عزت اُن بڑوں بوڑھوں میں تو موجود ہے، جن کی سرشت میں غلامی شامل ہوچکی ہے لیکن نسلِ نو اِس نام نہاد عزت اور غلامی کے کسی تصور سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں ہے:

> بڑے بوڑھے جنھوں نے اُس کے خاندان کے ٹھاٹھ دیکھے تھے یا وہ جو پابندِ رسومِ کہن تھے، وہ آج بھی اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ، اُسے چارپائی کے سرہانے جگہ دیتے،خود پائنتی پر بیٹھتے اور اُس کی باتیں بنا جواب دیے سر جھکا کر سنتے ،لیکن نئے نئے جوان ہوئے لڑکے جن میں سے کچھ قریبی کالج میں ایف اے ، بی اے کی تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے اُن کے لیے یہ بات تسلیم کرنا بڑا مضحکہ خیز تھا کہ ملک گام کی عزت کرو کیونکہ وہ اس گاؤں کے سابق حکمران خاندان کی یادگار ہے۔[۵]

مندرجہ بالا اقتباس طاہرہ اقبال کے اُس گہرے سماجی شعور کو ظاہر کر رہا ہے جہاں بین السطور وہ تبدیلی بھی دیکھی جاسکتی ہے جو جاگیردارانہ سماج میں کسی انقلاب میں بدل سکتی ہے اور اس تبدیلی کا ذریعہ یعنی تعلیم بھی دکھائی دے رہا ہے ۔ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جو پرانی نسل کے اُن نمائندہ کرداروں کے برعکس، جو خاموشی سے سرِ تسلیم خم رکھنے کے عادی ہیں، سوال پر اُکساتا اور اِس غلامی کے خلاف مزاحمت کی ترغیب دیتا ہے۔ اِس جاگیردار طبقے کے یہاں محنت کش طبقے کو حاصل مقدور بھر زندگی کے وسائل بھی جس نوع کی عنایت اور بخشش کا احساس لیے ہوئے ہیں اُس کی مثال دیکھیں:

> بادشاہو! ان کمیوں کے نخرے۔ یہ ترکھانوں کا ٹبر جس احاطے میں بیٹھے ہیں وہ پردادا جی نے دادا جی کی پیدائش پر بخشش میں دیا تھا۔کمیوں کے ہر خاندان کو دو دو بیگھ زمین دی، جس جس احاطے میں بیٹھے تھے اُس کا مالک بنا دیا۔ پر ہوئے نا وہی نچلی ذات کے۔[۶]

مادی وسائل میں عدم مساوات کے نتیجے میں کم حیثیت طبقے سے نفرت کا یہ احساس دیہی سماج میں راسخ ہے اور نچلی ذات سے تعلق اپنی جگہ ایک ہزیمت ہی نہیں گالی کا درجہ رکھتا ہے۔ افسانے میں ملک صاحب کا یہ مختصر سا مکالمہ بھی دیکھیے جو جاگیردارانہ ذہنیت کو واضح کر رہا ہے:

> جدی پشتی رعیت ہیں۔ بادشاہو! اپنی جدی پشتی رعیت۔[۷]

یہ وہ راسخ احساسِ برتری ہے جو یہ طبقہ اپنا استحقاق سمجھتا ہے اور مقابل طبقے کو غلام در غلام رکھنے کا قائل ہے۔

افسانہ ''گندا کیڑا'' جاگیردارانہ سماج کی اُس سفاکی کو موضوع بنا رہا ہے جہاں نچلے طبقے کی

عورتیں جاگیرداروں کے لیے عیاشی کا سامان ہیں جنھیں استعمال کے بعد پھینکنے کا ملال بھی موجود نہیں ہے۔ گوری خانہ بدوش لڑکی اور حویلی کی ملازمہ ہے۔ ایسی حویلی جہاں بڑی مالکن اور اُس کے تین جواں سال بیٹے رہتے ہیں۔ یہ تینوں فرزند روایتی جاگیردارانہ ذہنیت کے نمائندے ہیں۔ گوری حاملہ ہے اور لطف تو یہ کہ یہ بھی طے نہیں ہوتا کہ اِس حمل کا سبب تینوں نوجوانوں میں سے کون ہے؟ اُنھیں اِس صورتِ حال سے کوئی سروکار نہیں اور وہ اپنی روایتی مصروفیات یعنی شکار، خدمت گزاری یا عیاشی میں مصروف ہیں۔ اِن کرداروں کے رہن سہن اور مصروفیات کی جھلک دیکھیے جو جاگیردار کے کردار کا تصور واضح کر رہی ہیں:

> تبھی باہر جیپوں کے رکنے اور شکاری کتوں کے پٹوں میں بجتی گھنگریوں کی آوازیں پورے ماحول پر حاوی ہوگئیں اور دھول کے اُڑتے ہوئے غباروں نے پوری حویلی کو لپیٹ لیا۔[۸]

دوسری جانب افسانے میں طبقاتی تفاوت کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے جب ایک طرف برستی بارش میں افلاس زدہ خانہ بدوشوں کے خیمے رِس رہے ہیں تو دوسری جانب صبح سویرے شکاری کتوں کی خدمت کی جا رہی ہے۔

> پانی خیمے کے کپڑے سے پھوار کی مانند اندر ٹپکتا تھا۔[۹]

> اُس وقت ملازم شکاری کتوں سے گرم کپڑے اُتار کر اُن کے جسموں کی مالش کر رہے تھے اور بادام ملے مکھن کے پیڑے کھلا رہے تھے۔[۱۰]

افسانہ ''کھندے'' کا موضوع بھی جاگیردارانہ سماج میں نچلے طبقے کی ذاتوں کو استعمال کی شے اور اُن کی تذلیل کو استحقاق سمجھتا ہے۔ عارفے مراثی جیسے بہت سے کردار نچلے طبقے کے نمائندہ ہیں جن کی ذلت سے ہی جاگیردار کی حاکمیت کا پتا ملتا ہے:

> ملک نے گھڑ گھڑ گھڑک پورے زور سے حقہ گڑگڑا کر چاندی کی نے اُگل کر دھول میں تھوکا۔ ''عارفے عارفے میراثی''، ''جی بادشاہ جی۔'' عارفہ جیپ کے ٹائر سے اُکھڑ کر سامنے ڈھیر ہوگیا۔[۱۱]

> ملک کی بھویں ترچھی ہوگئیں۔ شکاری کتوں کی باگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ باہر تڑپتی

> زبانیں، اُٹھے ہوئے کان، سڈول کمر، جگمگاتی جلد میں سانس لیتی تڑپتی نسیں، گلے میں بندھی گھنگھریوں کی جھنکار اور قدموں کی ڈگڑ ڈگڑ میں عارفے کی چیخیں لپٹ گئیں۔
>
> ''مرگیا نہیں بچتا۔ حلقا ہو کے مرساں۔''[۱۲]

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات میں نظر آنے والے دونوں مناظر جاگیردار کے خوف اور حاکمیت کے احساس کو عیاں کر رہے ہیں۔

''انتخاب'' طاہرہ اقبال کا ایسا افسانہ ہے جو دیہی سماج میں الیکشن سے پہلے اور بعد کے اُن مناظر کو اپنی حقیقی صورت میں سامنے لا رہا ہے جو نام نہاد جمہوریت کے پس پردہ اُن عوامل کی نشان دہی کرتا ہے جہاں حق رائے دہی فرد کا معاملہ نہیں، بلکہ برادری یا جاگیرداروں کی منشا سے مشروط ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں ایک بڑی اکثریت کی حامل خواتین ووٹرز کو اِس سارے عمل سے شعوری طور پر لاتعلق کر دیا جاتا ہے۔ مرد ہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اِس مرتبہ ووٹ کس کو دیا جائے گا اور کس کو نہیں۔ اور اس فیصلے کے پیچھے بھی کوئی سماجی شعور نہیں نام نہاد عزت افزائی اور طاقت کا اثر تلاش کیا جا سکتا ہے۔ افسانے میں دیہات کی نسبتاً چھوٹی مگر اثر و رسوخ رکھنے والی زمیندار برادریاں، چودھری اور راجے، علاقے کے بڑے جاگیردار اور الیکشن میں حصہ لینے والے امیدوار رانا صاحب سے اپنی وفا داری اور مراسم کے شوق میں اپنے زیرِ اثر چھوٹے کاشت کاروں کی منشا کے فیصلے بھی خود ہی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

قاری کو افسانے کا آغاز ہی اُس منظر سے روشناس کرواتا ہے جہاں چودھری ریاض علی خدمت گاروں کے بیچ روایتی ٹھاٹھ سے بیٹھا نظر آتا ہے۔ یہ ٹھاٹھ ہمارے دیہی سماج کے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکا ہے۔ سو کہانی کاروں کے ہاں چودھری کا کردار آتے ہی ایسا منظر سامنے آ جاتا ہے کہ اب فطری سی بات محسوس ہوتی ہے جو اِس کردار کے مجموعی تصور کو نمایاں کرتی ہے:

> دہکی ہوئی چلم کی محراب نما چھت سے ابھی بھاپ اُٹھ رہی تھی، ملازم حقے کی نے موڑ کر چودھری ریاض علی کے منہ کے قریب لا رہا تھا۔[۱۳]

اور پھر اسی منظر سے جڑا اگلا منظر بھی دیکھیں جہاں حقے کی نے تک ایک ملازم سے اپنے

منہ کے قریب لانے والا چودھری جب خود سے بڑے جاگیردار اور الیکشن امیدوار کی آمد کی خبر سنتا ہے:

> چودھری ریاض علی گھبرا کر اُٹھا تو حقے کی نے تو مُنہ سے ٹکرا کر رُخ پھیر گئی اور دھوتی کی ڈبیں ڈھیلی پڑ گئیں، وہ سرعت سے دائیں بائیں ڈب اڑسنے لگا۔[۱۴]

اور پھر اِسی چودھری کی وہ تقریر بھی دیکھیے جب وہ لوگوں کو متفقہ طور پر رانا صاحب کو ووٹ دینے پر راضی کر رہا ہے۔ ایسے میں گاؤں کے نئے سماج میں سست رفتاری سے پھیلتا شعور اُسے کیسے بُرا لگ رہا ہے:

> بھائیو! گاؤں کا چلن بدل گیا ہے لوگ بے لحاظ اور خودسر ہو چکے ہیں ہر ہر گاؤں میں مڈل اور ہائی سکول کھل رہے ہیں۔ ہر تحصیل ہیڈ کوارٹر میں کالج بن گئے ہیں۔ کمی کمین کے لڑکے پڑھ لکھ کر کلرک اور وکیل بن رہے ہیں۔ اب تو دو دو ایکڑ والے بھی ہم سے توقع رکھتے ہیں کہ ہم خود جا کر اُن سے ووٹ مانگیں۔[۱۵]



اقتباس میں اُس جاگیردارانہ ذہنیت کی عمدہ عکاسی ملتی ہے جو تعلیم کو اپنے لیے ایک بڑا حریف خیال کرتی اور راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ گردانتی ہے۔ پھر نچلے طبقے کے افراد کے لیے یہ حقارت آمیز لہجے اور لغت بھی دیہی سماج کا ایسا معمول ہے جس سے خود اِس کا شکار طبقہ بھی سمجھوتہ کر چکا ہے۔ اِس طبقے کا معاشی اور جنسی استحصال تو خیر ہوتا ہی ہے اُن کی سوچ کو بھی اپنی منشا کے مطابق استعمال کرنے اور حیوانوں کی سی حیثیت میں رکھنے کا چلن بھی اس سماج میں معمولی سی بات ہے۔ افسانے میں الیکشن کی انھی سرگرمیوں میں چودھری ریاض اور راجہ داد کے درمیان کچھ اخلاقی ضابطوں کی صورت بھی دیکھیے جہاں عام آدمی ایک انسان کی بجائے محض چیز کی حیثیت رکھتا ہے جسے جب جہاں چاہے رکھا جا سکتا ہے:

> ہمارے پرکھوں سے الیکشن کے چند اصول طے ہیں ...... عورتوں کے ووٹ کبھی نہیں ڈلے اب کے بار بھی نہیں ڈالے جائیں گے۔ کمیوں کے ووٹ آدھے آدھے تقسیم ہوں گے۔ گاؤں میں کل پچیس ووٹ کمیوں کے ہیں۔ بڑے ووٹوں میں تیرہ آپ کی طرف جائیں گے اور بارہ ہماری طرف اور چھوٹے ووٹوں میں تیرہ ہماری طرف اور بارہ آپ کی طرف۔ اپنے اپنے مزارعوں اور ٹھیکیداروں کے ووٹ پکے ہیں۔ انھیں

توڑنے کی کوشش لڑائی کا آغاز سمجھا جائے گا۔[۱۶]

یہ وہ تلخ مگر حقیقی صورتِ حال ہے جو اِس سماج میں دکھائی دیتی ہے۔ووٹوں کی اِس تقسیم میں خود ووٹ دینے والے شریک ہی نہیں ہیں لیکن افسانے میں چند ایکڑ کے ایسے کاشت کاروں کہ جن کی اولادیں تعلیم حاصل کر رہی ہیں، سے اِس سارے نظام کو ایک خطرہ لاحق ہے۔اب نسل دَر نسل منتقل ہوتی وفاداریاں تبدیل ہونے کے خدشات بھی سر اُٹھانے لگے ہیں جو دراصل اِس بات کا اشارہ ہیں کہ عہدِ نو مزاحمت اور اپنے حق کا شعور اُجاگر کرنے والا ہوگا:

> اگرچہ یہ لوگ بھی نسل دَر نسل جس خاندان سے اپنی وفاداریاں استوار رکھتے تھے اسی عہدِ دیرینہ کے پابند تھے لیکن زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ نئے نئے جوان ہوئے لڑکوں کو تعلیم اور شہر کی ہوا لگ رہی تھی۔جس سے انھیں اپنی انفرادیت اور اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔[۱۷]



اُمید کے اِس پہلو کے باوجود افسانے میں نسل دَر نسل غلامی کے شکنجے میں کسے وہ لوگ اکثریت میں دکھائی دیتے ہیں جو آج بھی پاؤں چھوکر ہاتھ جوڑنے میں ہی اپنی بقا تصور کرتے ہیں اور ایسے میں اگر دو زمیندار ایک ہی وقت میں اِس نچلے طبقے کے کسی فرد کے سامنے آجائیں تو صورتِ حال یہ بھی ہو جاتی ہے:

> دلو میراثی کبھی ایک کے پاؤں چھوتا، کبھی دوسرے کے سامنے ہاتھ جوڑتا۔[۱۸]

اِسی طرح آگے چل کے جب ووٹوں کی گنتی مکمل ہوتی ہے اور پہلے طے شدہ ضابطے سے انحراف کرتے ہوئے تین ووٹ اپنی مرضی کا پتہ دیتے ہیں تو اِسے بے ایمانی قرار دیا جاتا ہے اور پھر جیتنے والے امیدوار اور ہارنے والوں کے درمیان جھگڑے میں عام ڈرائیور کی موت ایسے مناظر ہیں جن سے کسی مقتدر فرد کو سروکار نہیں ہے۔

افسانہ ''چرواہا'' گاؤں کے اُس مفلس اور کمزور چرواہے کی کہانی ہے جس کے لیے زیست چودھری کی خدمت گزاری اور اپنے ریوڑ کے خیال رکھنے کا نام ہے۔جو حویلی کے اندر چودھری کی بیٹی کے لیے سرکنڈوں کی کچی تیلیوں کے چھتے لے کر جاتا ہے کیونکہ اُسے وہ پسند ہیں اور پھر بیٹی کی آنکھ

میں اس چرواہے کے لیے ممنونیت دیکھ کر چودھری چرواہے پر تشدد کی انتہا کر دیتا ہے۔ ظلم کے خلاف مزاحمت کا شعور اور طاقت نہ ہونے کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ چرواہا حشرات اور پرندوں کو بے دردی سے مار مار کر اپنے اندر کے غصّے کی تشفّی کرتا ہے۔ اور پھر آخر میں اپنی ماں کے ساتھ چودھری کو ہم بستری کرتے دیکھ کر اینٹ سے چودھری کا بھیجا بھی نکال دیتا ہے۔

اس چرواہے کے کردار میں نچلے طبقے کے اُس بے توقیر فرد کی ایسی صفات موجود ہیں جو اُس کی ذلت کو ایک طبقے کا مشغلہ بنا دیتی ہیں:

> وہ اتنا بے وقعت اور حقیر تھا کہ بے وقعتی اور حقارت از خود اُس سے شرماتی تھی۔ گویا اُس کی ذات تشدد پر اُکسانے والا خود بڑا محرک تھی۔ ذلیل کو ذلیل کرو کا چلتا پھرتا اشتہار۔ پتہ نہیں ایسے انسان خدا پیدا کرکے لوگوں کو گناہگار بننے کا موقع کیوں فراہم کرتا ہے جنھیں دیکھ کر خواہ مخواہ ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگے اور زبان نئی نئی گالیوں کا اختراع کرنے لگے۔[19]

معاشرے کے ایسے دھتکارے ہوئے اور بے بس کردار کے اندر توقیر اور بدلے کی جو خواہش پیدا ہوتی ہے وہ بے بسی کے بعد کچھ اِسی طرح کے ردِعمل کو پیدا کر سکتی ہے:

> زخموں پر بھنبھنانے والی مکھیوں کو مٹھی میں پکڑ لیتا اور ایک ایک پر، ایک ایک ٹانگ الگ الگ کرتا اور سیاہ کھردری ہتھیلیوں سے مسل مسل کر مار ڈالتا۔ مار ڈالنے کا برتر احساس اُس کے اندر وجد طاری کر دیتا۔[20]

افسانے میں اپنی معاونت پر چودھری کی بیٹی جس طرح آنکھوں میں ممنونیت لیے اِس کردار کو دیکھتی ہے اور چودھری اِس ممنونیت کو محسوس کرتے ہوئے جس انداز میں اِس بے بس کردار پر تشدد کرتا ہے وہ اپنی جگہ جاگیردار کے کردار کے اُس پہلو کی نشان دہی کر رہا ہے جو طاقت اور ظلم سے اپنی حیثیت کا اثبات چاہتا ہے۔ تشدد کی یہ صورت اِس اقتباس میں دیکھیے:

> وہ بیرونی دروازے کی جانب بھاگا۔ لیکن انھوں نے بڑھ کر بالوں سے کھینچ لیا اور زمین سے دو فٹ اوپر اُٹھا کر پختہ دیوار پر پٹخا۔ سر سے مٹھی بھر بال نکل کر فضا میں اُڑنے لگے اور خون کی دھاری دیوار پر چلتی ہوئی قطرہ قطرہ فرش پر ٹپکنے لگی۔ چودھری

> نے بڑھ کر شکاری بوٹ والا پاؤں کنپٹی پر دھر دیا اور سر کو یوں مسلنے لگا جیسے کسی ٹاٹ پر بوٹ صاف کر رہا ہو۔ اُس کے منہ اور ناک سے خون کے لوتھڑے اُبل کر سنگِ مرمر کے شفاف فرش کو آلودہ کر گئے۔[۲۱]

اِس بہیمانہ تشدد اور سفاکی کا نفسیاتی ردِ عمل اس چرواہے کے یہاں یوں دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ لالیاں اور چڑیاں مارتا اور خوش ہوتا ہے:

> ڈھیلے مار مار کر اُن کی نازک نازک ٹانگیں توڑتا، لالیاں اور چڑیاں زخمی ہو کر گرتیں اور کھیت کی دراڑوں میں چونچیں گھسیڑنے لگتیں۔ وہ سیدھے کھر درے تلووں والے پاؤں اُن کے سروں پر رکھ رکھ کر چلتا۔ کرچ کرچ نازک کھوپڑیاں ٹوٹتیں۔ خون آلود مغز باہر بہتا۔ اُس کے اندر کامیابی والی مخصوص سرشاری ہلہ بول دیتی۔[۲۲]



بے بسی اور محکومیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اِس نفسیاتی حالت کا تلخ انجام اُس وقت افسانے کے اختتام میں سامنے آتا ہے جب چودھری اُس کی ماں کے ساتھ اِس احساسِ برتری کے ساتھ ہم بستری کرتا نظر آتا ہے جیسے وہ اس کا استحقاق رکھتا ہے اور چرواہا بے وجہ خلل ڈال رہا ہے۔ ایسے میں وہ اینٹ سے چودھری کی کھوپڑی بھی پھوڑ دیتا ہے۔ جاگیردار کا ایک مفلس اور بے بس آدمی کے ہاتھوں یہ انجام بھی اُسی تبدیلی کی علامت ہے جو بے بسی کی انتہائی صورت میں شدید ترین مزاحمت میں ڈھل جاتی ہے۔

جاگیردار کے کردار کا ایک اور تصور طاہرہ اقبال کے افسانے ''عزت'' میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں چودھری عزت کا معیار جنسی برتری میں پوشیدہ سمجھتا ہے۔ افسانے میں جاگیردارانہ سماج کے اُسی نام نہاد عزت کے معیار کو موضوع بنایا گیا ہے جہاں چودھری اپنے نابالغ سکول جانے والے بیٹے کی نہ صرف شادی کرتا ہے بلکہ یہ خواہش بھی رکھتا ہے کہ وہ جنسی طور پر ایک بھرپور اور برتر مرد کا کردار ادا کرے۔ اُس کے نزدیک مرد ہونے یا برتر ہونے کا معیار ہی اِس برتری میں پوشیدہ ہے لیکن اِس کے برعکس بیٹا ابھی نابالغ اور معصوم ذہن کا مالک ہے جسے اب بھی اپنی والدہ کے ساتھ سونے یا پڑھنے کی خواہش ہے۔ بیٹے کو بار بار اُکسانے اور جنسی ترغیب دینے کے باوجود وہ جب اُس کے اِس ردِ عمل کو دیکھتا ہے تو اکثر جھلا اُٹھتا ہے اور اُسے نامردی تک کے طعنے دیتا ہے۔

نڈیاں بی بی! مرد کبھی عورت سے چھوٹا ہوا ہے؟ اِدھر جوانی کا سال لگا اُدھر وہ اپنی ماں سے بھی بڑا ہوگیا۔ جتنی اونچی گردن اُٹھا کے بیٹے کو دیکھتی ہے۔ اتنا ہی ڈرتی ہے۔ ایک یہ قاسو ہے سسرا جو اپنی رَن سے بھی چھوٹا ہو گیا ہے۔ بے غیرت! مجھے تو اپنا نطفہ ہی نہیں معلوم پڑتا۔ کسی کھسرے کا جنا ہے تُو نے۔[۲۳]

کہتا ہے لڑکے مذاق اُڑاتے ہیں کہ تیری ابھی سے شادی ہو گئی۔ کیوں؟ شادی مرد کے بچے کی نہیں ہوتی۔ تو کیا کھسروں کی ہوتی ہے؟[۲۴]

بارہ تیرہ سال کا لڑکا بالغ ہوجاتا ہے۔ یہ ہے ہی زنخا۔ ورنہ بالو جیسی عورت سامنے ہو تو آٹھ سال کا لڑکا بھی ایک جھٹکے میں جوان ہو جائے۔[۲۵]

مندرجہ بالا اقتباسات میں چودھری کی اُس فطرت کو بخوبی سیکھا جاسکتا ہے جہاں اُس کے نزدیک مرد کا برتر تصور محض اُس کی جنسی قوت سے جڑا ہوا ہے اور وہ ایک بچے کو بھی یہ رعایت دینے پر آمادہ نہیں۔ خود بہو کے متعلق بھی اُس کا یہ خیال کہ بالو جیسی عورت دیکھ کر آٹھ سال کا لڑکا بھی ایک جھٹکے میں جوان ہو جائے، اُس کی اُس جاگیردارانہ ذہنیت کی عکاسی کر رہی ہے جہاں عورت کا تعارف محض اُس کی جنسی کشش سے جڑا ہوا ہے۔



چودھری کی یہ جھلاہٹ اُس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب اُس کی بیوی کا نوجوان بھتیجا گھر آنے جانے لگتا ہے۔ چودھری کو یہ بات گوارا نہیں ہوتی لیکن چودھرائن کا مصلحت آمیز مشورہ کہ گھر کی بات گھر رہے گی، اپنی جگہ حیرت انگیز اور قابل توجہ ہے جس پر چودھری بھڑک اُٹھتا ہے اور آخر میں گھر میں بہو اور اُس نوجوان کو اکیلا پا کر اُسے مارنے کو دوڑتا ہے لیکن وہ فرار ہوجاتا ہے۔ لیکن پلٹ کر جب اکیلے گھر میں بہو کے سراپے پر نگاہ دوڑاتا ہے تو وہ توقع خود پوری کر دیتا ہے جو اُس نے اب تک بیٹے سے وابستہ کر رکھی تھی۔

افسانے میں جاگیردارانہ ذہنیت کی کئی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں جہاں تعلیم ایک غیر ضروری چیز ہے۔ اصل قوت علم کی نہیں جائیداد کی ہے:

نہ تُو نے دو ہزار کا چپڑاسی بنا ہے کہ تین ہزار کا کلرک لگنا ہے، اِن کتابوں میں تو ڈھونڈنا کیا ہے۔ ڈھائی مربعے کا اکیلا وارث۔ ڈیڑھ پکا مربع ایک گھوڑی پال۔

مربعے بھی سونے کے بھرے تھال۔تو یہ کتابیں چھوڑتا کیوں نہیں۔[۲۶]

یہ وہ روایتی جاگیردار ذہن ہے جو شعور کا معیار علم کی بجائے زمین کو سمجھتا ہے اور اِس کے حصول کے لیے ہر طرح کے اخلاقی ، سماجی تقاضوں کو بالائے طاق رکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا ۔مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ طاہرہ اقبال کے یہاں وسطی پنجاب کے اُس زوال پذیر جاگیردارانہ سماج کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے جو اب وسیع جاگیر کے مالک نہیں لیکن اُن کے ہاں تفاخر اور برتری کے سارے ذرائع طاقت اور زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ جاگیردار اُن کے ہاں بھی ظلم و بربریت اور ناانصافی کی علامت ہے۔تاہم نئے عہد میں اِس سماج کے خلاف مجتمع ہونے والی مزاحمت کی جھلکیاں بھی اُن کی کہانیوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

## حوالہ جات

- * اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو و اقبالیات، اسلامیہ یونی ورسٹی اوف بہاول پور۔
- ۱۔ انوار احمد، اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ (فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص۵۵۔
- ۲۔ رشید امجد، ''فلیپ'' مٹی کی سانجھ از طاہرہ اقبال (اسلام آباد/لاہور/ کراچی: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)۔
- ۳۔ طاہرہ اقبال، ریخت (لاہور: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص۲۲۔
- ۴۔ ایضاً، ص۲۳۔
- ۵۔ ایضاً۔
- ۶۔ ایضاً، ص۲۶۔
- ۷۔ ایضاً۔
- ۸۔ ایضاً، ص۳۴۔
- ۹۔ ایضاً، ص۳۶۔
- ۱۰۔ ایضاً، ص۳۷۔
- ۱۱۔ ایضاً، ص۸۴۔
- ۱۲۔ ایضاً، ص۸۵۔
- ۱۳۔ ایضاً، ص۸۸۔
- ۱۴۔ ایضاً۔
- ۱۵۔ ایضاً، ص۹۲۔
- ۱۶۔ ایضاً، ص۹۳۔

۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ ایضاً، ص۹۲۔

۱۹۔ ایضاً، ص۱۴۔

۲۰۔ ایضاً، ص۱۳۔

۲۱۔ ایضاً، ص۱۲۲۔

۲۲۔ ایضاً، ص۱۲۲–۱۲۳۔

۲۳۔ طاہرہ اقبال، گنجی بار (اسلام آباد/لاہور/کراچی: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص۵۱۔

۲۴۔ ایضاً، ص۴۹۔

۲۵۔ ایضاً، ص۴۷۔

۲۶۔ ایضاً، ص۵۸۔

## مآخذ

احمد، انوار۔ اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ۔ فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

اقبال، طاہرہ۔ ریخت۔ لاہور: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

______۔ گنجی بار۔ اسلام آباد/لاہور/کراچی: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

امجد، رشید۔ "مٹی کی سانجھ"۔ مشمولہ طاہرہ اقبال۔ اسلام آباد/لاہور/کراچی: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء۔